جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ

ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

الحمد للہ و کفی و الصلوۃ و السلام علی عبادہ الذین اصطفی خصوصا علی افضلھم سید المرسلین خاتم النبیین

محمدِ الامین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین...... امّا بَعد:

فاعوذ باللہ من الشّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِهٖ لِیَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ۝۱﴾

﴿وَقَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا ۝۳۰﴾

﴿فَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِیۡنَ وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا كَبِیۡرًا ۝۵۲﴾ (الفرقان)

﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ص﴾ (آل عمران:۳:۱۰۳)

صدق اللہ العظیم

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد :

میں نے جہاں تک غور کیا ہے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری دینی' ملّی' قومی اور معاشرتی زندگی میں اِس وقت پانچ محاذ ایسے ہیں جو جہاد بالقرآن کے شدید طور پر متقاضی ہیں ——رہا مسلمانوں سے باہر کا دائرہ تو وہ ابھی بڑی دُور کی بات ہے۔ پہلا مسئلہ تو ''Physician heals thyself'' کے مصداق خود اپنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو پوری نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لیے برپا فرمایا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:﴿كُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ﴾''تم وہ بہترین امت ہو جس کو نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے''——دنیا کی دوسری قومیں اپنے لیے جیتی ہیں لیکن تمھیں ان کے لیے جینا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؒ

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے' جام رہے؟

ہماری مثال تو اس ساقی کی سی ہے جس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا جامِ ہدایت تھما دیا ہے اور ایک ایک فردِ نوعِ بشر کو اس سے سیراب کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہرائی ہے۔ لیکن میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ اِس وقت یہ خیرِ اُمت اور اُمت وسط خود کئی طرح کے ذہنی' فکری' اعتقادی' نفسیاتی' جذباتی اور عملی انتشار سے دوچار ہے اور اسے مختلف روگ لگ گئے ہیں۔ یہ اس وقت نہایت مہلک اور مزمن امراض میں مبتلا ہو چکی ہے——اور یہ کوئی دو چار برس کی بات نہیں ہے' ہمارا یہ زوال و انحطاط صدیوں پر پھیلا ہوا ایک عمل ہے۔

لٰہذا پہلی اور مقدم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی ملّت اور معاشرے کے دائرے کے اندر جائزہ لیں کہ اس وقت وہ کون کون سے فکری‘ نظریاتی اور عملی محاذ ہیں جن پر ہمیں قرآن مجید کی شمشیر بُرّاں کو ہاتھ میں لے کر صف آراء ہونا ہے اور ان کے بارے میں ہمیں قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے کیا بنیادی و اساسی ہدایات ملتی ہیں۔ نیز ان ہدایات کے انطباق کے عملی طریقے اور تقاضے کیا ہیں؟ اس مسئلہ پر غور و فکر کے نتیجے میں اِس وقت پانچ محاذ میرے سامنے آئے ہیں۔

محاذ اوّل

جاہلیّتِ قدیمہ

اس ضمن میں سب سے بڑا محاذ جاہلیّت قدیمہ کا ہے۔ بڑا اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے عوام کی اکثریت کا معاملہ ہے۔ عوام الناس کی بڑی عظیم اکثریت کے اندر جاہلیّتِ قدیمہ رچی بسی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ جاہلیّتِ قدیمہ کی اس اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ قرآن مجید اور احادیث شریفہ کی رو سے اسلام سے پہلے کے دور کو ’’دورِ جاہلیّت‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی حقانیت‘ صداقت اور ہدایت کے برعکس جو کچھ بھی پہلے تھا اور جو کچھ اب ہے وہ ’’جاہلیّت‘‘ ہے۔

جاہلیّت کو جہالت کے معنوں میں مت لیجیے گا‘ یہ خلط مبحث ہو جائے گا۔ ویسے جہالت کے بھی عربی میں وہ معنی نہیں ہیں جو ہم اُردو میں استعمال کرتے ہیں۔ اُردو میں ہم اَن پڑھ انسان کو جاہل کہتے ہیں‘ یعنی عالم کے مقابلے میں اُردو میں جاہل کا لفظ مستعمل ہے‘ جبکہ عربی میں جاہل کا لفظ حلیم کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ ایک وہ انسان ہے جو بردبار ہے‘ صاحبِ عقل ہے‘ غور و فکر کرتا ہے‘ محض جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا‘ بلکہ عقل کی رہنمائی میں فیصلے کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ متعین کرتا ہے۔ عقلی دلیل کی بنیاد پر کسی بات کو قبول یا مسترد کرتا ہے۔ یہ ہے حلیم انسان۔ اور ایک شخص وہ ہے جو جذباتی ہے‘ اکھڑ ہے‘ غیر مہذب ہے‘ ناشائستہ ہے‘ شہوات و جذبات کی رَو میں بہہ جاتا ہے۔ اس کی عقل پر تعصّبات و خواہشات کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا شخص پی ایچ ڈی ہو‘ بہت تعلیم یافتہ انسان ہو‘ لیکن اسلام کی رُو سے یہ شخص جاہل ہے۔ جاہل سے ’’جہالت‘‘ بنے گا‘ لیکن اسی لفظ جہل سے ’’جاہلیّت‘‘ کی اصطلاح بنتی ہے‘ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے ماوراء اور اسلام کے سوا جو کچھ ہے اور جو کچھ تھا!

جاہلیّتِ قدیمہ کے اجزائے ترکیبی

اِس جاہلیّت کو میں اس وقت دو حصوں میں تقسیم کر کے آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ایک جاہلیّت قدیمہ ہے۔ یہ وہ جاہلیّت ہے جو عرب معاشرے میں اُس وقت نہایت غالب عنصر کی حیثیت سے موجود تھی جس وقت نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ یہ جاہلیّت قدیمہ دو چیزوں سے مرکب تھی۔ ایک شرک‘ یعنی مشرکانہ اوہام‘ جو توحید کی ضد ہے—— اور دوسرے ’’شفاعت باطلہ‘‘ کا تصور و عقیدہ‘ جو ایمان بالآخرۃ کی ضد ہے۔

جاہلیّتِ قدیمہ میں اللہ کا انکار نہیں تھا۔ مشرکین مکّہ اللہ کو مانتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا شخص جو گاہ بگاہ بھی ترجمہ دیکھ لیتا ہے اُس پر یہ حقیقت روشن ہوگی کہ قرآن نے متعدد بار یہ بات کہی ہے کہ اے نبیؐ! اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ لوگ فوراً پکار اٹھیں گے کہ اللہ نے!(۱) اور اے نبیؐ! اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے بارش کون برساتا ہے اور اس کے ذریعے سے مردہ زمین سے

نباتات کون اُگاتا ہے تو فوراً کہیں گے کہ اللہ![2] —— تو وہ اللہ کے منکر نہیں تھے۔ البتہ انہوں نے اللہ کے ساتھ دیگر معبودوں کی ایک فوج تصنیف کر رکھی تھی۔ کہیں وہ اللہ کے ساتھ جنات کو پوجتے تھے‘ کہیں انہوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے کر اُن کے نام پر دیویاں تراش لی تھیں اور ان کے لیے استھان بنا لیے تھے‘ جہاں وہ چڑھاوے چڑھاتے تھے‘ وہاں جا کر منتیں مانتے تھے اور دعائیں کیا کرتے تھے۔ یہ تھا ان کا شرک! یہ شرک آج بھی آپ کو اپنے عوام میں بتمام وکمال ملے گا‘ ایک شوشے کا فرق نہیں ہے۔ اس شرک نے صرف ہیئت بدل لی ہے کہ آج پتھر کی بنی ہوئی مورتیاں سامنے نہیں رکھی جاتی ہیں‘ لیکن قبروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے جو اُس دَور میں بتوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ سرمو فرق نہیں۔ عرسوں کے نام سے یہ جو بڑے بڑے میلے ہوتے ہیں ذرا ان میں جا کر دیکھئے کہ وہاں کیا ہوتا ہے! میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نے عرب کے دورِ جاہلیّت کے میلوں کی روداد یں پڑھی ہوں تو وہ شاید ان سے کہیں پیچھے رہ جائیں۔ تو اس جاہلیّتِ قدیمہ کا ایک جزو تو یہ شرک ہے!

جاہلیّتِ قدیمہ کا دوسرا جزو شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ وتصور ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ تم مانتے ہو کہ اللہ ہی خالق ہے‘ اللہ ہی مالک ہے‘ اُسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے‘ اُسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے تو ﴿فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ﴾[1] اور ﴿فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ﴾[2] یہ سب کچھ مان کر کہاں سے اندھے ہوئے جا رہے ہو؟ کہاں سے پھرائے جا رہے ہو؟ کہاں سے تمہیں اُچکا جا رہا ہے؟ تمہاری مت کیوں ماری جا رہی ہے؟ اس کے جواب میں قرآن مجید نے ان کے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔ سورۂ یونس میں ان کا یہ قول نقل ہوا: ﴿وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۸) کہ ہم ان بُتوں کو خالق اور مالک تو نہیں مانتے‘ لیکن ہم کچھ برگزیدہ ہستیاں ضرور مانتے ہیں جن کے نام پر ہم نے یہ بُت بنا لیے ہیں۔ یہ ہستیاں مقربین بارگاہِ ربّ العزت ہیں۔ یہ اللہ کے لاڈلے اور چہیتے ہیں۔ فرشتے جن کو ہم نے دیویاں بنایا ہے‘ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں‘ اور بیٹیاں بہت لاڈلی ہوتی ہیں‘ کوئی لاڈلی بیٹی اگر فرمائش کرے تو کوئی باپ اس کی فرمائش کو ردّ نہیں کرتا۔ لہٰذا ہم جو اِن بُتوں کو پوجتے ہیں تو صرف اس لیے کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی بنیں گے‘ ہماری شفاعت کریں گے اور وہاں ہمیں چھڑوا لیں گے۔ گویا اللہ کے عدل وانصاف کے آگے یہ روک بن جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الزمر کی تیسری آیت میں ان کے اس باطل عقیدے کا ذکر فرما کر اس کی قطعی طور پر نفی فرما دی۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ط وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ م مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾﴾

’’آگاہ رہو کہ دینِ خالص اللہ ہی کا حق ہے (ہر نوع کی عبادت واطاعت کا سزاوار اور مستوجب و مستحق صرف اللہ ہے)۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسروں کو اپنا پشت پناہ اور مددگار بنا رکھا ہے (اس یقین کے ساتھ) کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں (وہ اللہ کے ہاں ہمارے اور اُس کے درمیان عفو ومغفرت کا واسطہ اور ذریعہ بن جائیں اور ہمیں اس کا قرب دلا دیں۔ اے نبیؐ ان کو متنبہ کر دیجیے کہ) اللہ اُن کے درمیان ان تمام باتوں کا (آخرت میں) فیصلہ فرما دے گا جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا‘ منکرِ حق اور ناشکرا ہو‘‘۔

تو وہ لوگ آخرت کے منکر نہیں تھے‘ البتہ آخرت میں محاسبہ سے محفوظ رہنے کے لیے شفاعتِ باطلہ کا تصور رکھتے تھے۔

یہ دو چیزیں یعنی شرک اور شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ اصلاً تو ایک ہی ہے۔ انہیں تصویر کے دو رُخ کہہ لیجیے۔ میں نے بغرضِ تفہیم انہیں علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے کہ جاہلیّتِ قدیمہ ان دو اجزاء سے مرکب تھی۔ قرآن مجید میں اس جاہلیّتِ قدیمہ کا ذکر نہایت جلی انداز میں ہے۔ چونکہ اُس دور میں یہی

شرک غالب تھا اور اصل گمراہی یہی تھی' لہٰذا مکی سورتوں کا سب سے بڑا مضمون یہی ہے۔ اور جن حضرات کو بھی قرآن مجید سے شغف ہے وہ اس بات کو جانتے ہوں گے کہ قرآن مجید کا دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ قرآن حکیم میں بار بار مختلف پیرایوں اور مختلف اسالیب میں' مختلف انداز سے اس شرک اور شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ کہیں تمثیلات کے انداز میں سمجھایا جا رہا ہے' کہیں عقلی دلائل کے ذریعے سے جھنجھوڑا جا رہا ہے' کہیں ان ہی کے موقف سے اُن پر حجت قائم کی جارہی ہے۔ سورۃ الکھف میں تصریف الآیات کے متعلق جو الفاظ آئے ہیں: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ (آیت ۵۴) اور ذراسی ترتیب کی تبدیلی کے ساتھ یہی بات سورۃ الاسراء میں بایں الفاظ آتی ہے: ﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ (آیت ۸۹)۔ یہ الفاظ اس بات کے اظہار کے لیے آئے ہیں کہ ہم نے کوئی طرزِ اسلوب اور کوئی اندازِ بیان چھوڑا نہیں ہے کہ جس کے ذریعے اس ضلالت و گمراہی کی نفی نہ کر دی ہو اور اس کا ابطال نہ کر دیا ہو۔ آج اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر اپنے معاشرے کا تنقیدی جائزہ لے تو اسے صاف نظر آجائے گا کہ ہمارے معاشرے کی عظیم اکثریت بھی انہی دونوں گمراہیوں میں مبتلا ہے۔ اس عظیم اکثریت کا دین اولیاء پرستی' عرس میلے اور تعزیہ پرستی کا دین ہے' قبروں پر حاضری اور وہاں چڑھاوے چڑھانے' منتیں ماننے اور دعائیں مانگنے کا دین ہے۔ نماز روزہ تو اس دین میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ اگر ہو جائے تو بڑی بات ہے' ورنہ یہ اس عوامی دین کے لزوم میں داخل نہیں۔ یہ اکثریت اس وہم میں مبتلا ہے کہ یہ اولیاء کرام جن کی قبروں پر ہم نذر و نیاز چڑھاتے ہیں' آخرت میں ہمارے سفارشی بن جائیں گے' اور پھر ہمارے سب سے بڑے شفیع خود رسول اللہ ﷺ ہوں گے جن کے ہم نام لیوا ہیں۔ چنانچہ کسی محاسبۂ اُخروی کے خوف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جاہلیّتِ قدیمہ کے خلاف قرآن کی تلوار کا استعمال

پہلا محاذ یہ جاہلیّت قدیمہ ہے جس کے خلاف ہمیں تلوار اٹھانی ہو گی۔ لیکن تلوار کون سی؟ قرآن کی تلوار!...... اس محاذ پر ابلیس کے اس فریب و اغوا کے لیے قرآن ہی تلوار کا کام دے گا۔ میں اس موضوع پر علامہ اقبال کے یہ اشعار بارہا آپ کو سنا چکا ہوں جن میں درحقیقت دو احادیث کی ترجمانی کی گئی ہے۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است　　زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی!　　کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

میں سمجھتا ہوں کہ اس جاہلیّت قدیمہ کے محاذ کے لیے کسی دقیق یا بھاری بھرکم علمی منصوبے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر صرف دورۂ ترجمۂ قرآن کی مہم ہمارے معاشرے میں چل جائے تو وہ لوگوں کے عقائد کی تطہیر کے لیے کافی ہو جائے۔ اس کے لیے دقیق و عمیق تفاسیر کی ضرورت نہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے یہاں ایک کام عظیم پیمانے پر ہو رہا ہے' لیکن کاش کہ وہ کام فضائل سے متعلق ضعیف و شاذ روایات سے بلند تر ہو اور اس کا تعلق ترجمۂ قرآن کے ساتھ قائم ہو جائے کہ ہر مسجد میں فرض نمازوں کے بعد لوگ جمع ہو جائیں اور قرآن حکیم کے متن کے ساتھ کوئی مستند ترجمہ لوگوں کو سنایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ (اِن شاء اللہ العزیز) قرآن مجید کے متن کے ساتھ مجرد ترجمہ اس جاہلیّتِ قدیمہ کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہو گا۔ اس کے لیے قرآن حکیم کی حکمت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر سمندر میں کہیں تیل گر جائے' فرض کریں کہ تیل کا کوئی ٹینکر پھٹ جائے تو تیل سطح سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے قرآن مجید میں جاہلیّت قدیمہ کا جو ابطال اور اس کی جو تردید ہے اور توحید خالص کی جو دعوت اور اس کے لیے جو استدلال ہے وہ بالکل سطح پر ہے' سامنے موجود ہے۔ اس کے لیے گہرائی میں اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تو یہ بات جان لیجیے کہ اس محاذ پر جب تک قرآن مجید کے ساتھ جہاد نہیں ہو گا تب تک مشرکانہ اوہام اور شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید ممکن

نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے یہاں فرقہ وارانہ انداز سے ان عقائد کے حاملین پر جو تنقیدیں ہوتی ہیں اور جس انداز سے ان کی نفی کی جاتی ہے‘ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح تو ضد اور ہٹ دھرمی میں اضافہ ہوتا ہے اور کدورت اور تلخی مزید پختہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ پھر وہاں معاملہ آ جاتا ہے فرقہ وارانہ عصبیت اور فرقہ وارانہ مفادات کا۔ چنانچہ اس رنگ اور اس انداز میں تردید کرنا اور چند مخصوص چیزوں کو نشانہ بنا کر انہی پر مسلسل گولہ باری کرتے چلے جانا‘ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ قرآن مجید نے اس مسئلہ کا جو "Panoramic View" لیا ہے اور اس کے وسیع پس منظر میں جس قابلِ فہم اور فصیح و بلیغ انداز اور بدیہیاتِ فطرت کے تاروں کو چھیڑنے والے اسلوب میں بیان کیا ہے‘ اس کے مقابل میں کون مسلمان یہ گمان کر سکتا ہے کہ وہ اس سے بہتر اور دلنشین انداز اور ناقابل تردید دلائل اختیار کر سکتا ہے؟ اور اگر یہ گمان کرے تو کیا اس کا ایمان سلامت رہ جائے گا؟ معاذ اللہ! کیا کوئی مسلمان بقائمیٔ ہوش و حواس یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کا بیان کردہ فلسفہ اور اس کے پیش کردہ دلائل قرآن حکیم کی حکمت اور آیاتِ بیّنات سے زیادہ محکم اور روشن ہیں؟ معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ!...... آیاتِ بیّنات تو وہ ہیں جن کے متعلق سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

’’وہی (اللہ تبارک وتعالیٰ) تو ہے جو اپنے بندے (محمد رسول اللہ ﷺ) پر روشن اور واضح آیات نازل فرما رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے‘‘۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت اور قرآن حکیم کا نزول اُس کی شانِ رأفت اور شانِ رحمانیت و رحیمیّت کے مظاہر اتم ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝﴾ (الرحمٰن)

پس اگر ملک گیر پیمانے پر قرآن مجید کے ترجمے کی مہم شروع ہو جائے تو میرے نزدیک یہ ہے پہلے محاذ کے روگ کا مداوا۔ میں نے اس کو نمبر ایک پر اس لیے رکھا ہے کہ عددی اعتبار سے ہماری ملت اور ہماری قوم کی عظیم ترین اکثریت درحقیقت اسی جاہلیّت قدیمہ کا شکار ہے۔

محاذ دوم

جاہلیّت جدیدہ

جہاد بالقرآن کا دوسرا محاذ جاہلیّت جدیدہ کے خلاف ہے۔ جاہلیّت جدیدہ الحاد و مادہ پرستی کا دوسرا نام ہے۔ اس میں اللہ کا انکار بھی ہے اور بعث بعد الموت کا بھی۔ اس میں مادے (matter) سے ماوراء کسی شے کو تسلیم کرنے سے اعراض اور احتراز ہے۔ اسی جاہلیّتِ جدیدہ کے لیے میں طبیعیاتی عقل پرستی یا Scientific Rationalism کا لفظ بھی استعمال کیا کرتا ہوں۔

جدید دَور کی اس جاہلیّت کی عمر قریباً تین سو برس ہے۔ یورپ کے دو ممالک فرانس اور جرمنی میں دو تحریکیں بیک وقت شروع ہوئی تھیں: ایک تحریک اصلاحِ مذہب (Reformation) اور دوسری تحریک احیاء العلوم (Renaissance)۔ بدقسمتی سے اُس وقت یورپ میں عیسائیت کے نام سے جو مذہب تھا وہ نہایت ظالمانہ و جابرانہ اور انتہائی غیر معقول اور بعید از انصاف نظام کا حامل تھا۔ اس میں ملوکیت (Monarchy) اور پاپائیت (Theocracy) کا گٹھ جوڑ تھا۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں ردّعمل کے طور پر مذہب سے ایک نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اس پس منظر اور اس فضا میں جب سائنس کی ترقی شروع ہوئی تو سائنس کی جڑوں میں الحاد پیوست ہو گیا اور سائنسی نقطۂ نظر یہ بن گیا کہ جو چیز (verifiable) نہیں ہے‘ جس کی ہم توثیق یا تردید نہیں کر سکتے‘ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہونی چاہیے‘ یہ چیزیں لائق اعتناء نہیں ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ ہم یقین

کے ساتھ یہ جان سکیں کہ اللہ موجود ہے یا نہیں ہے‘ تو اس پر ایمان چہ معنی دارد! اسی طرح ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں ہے۔ اس کا ہمارے پاس نہ کوئی سائنسی ثبوت ہے اور نہ کسی نے موت کی سرحد پار کرنے کے بعد پھر واپس آ کر ہمیں خبر دی ہے۔ لہٰذا اس کو چھوڑ یئے‘ یہ خواہ مخواہ کے ڈھکوسلے ہیں۔ کوئی اسے "Dogma" کے طور پر مانتا ہے تو مانتا رہے‘ لیکن یہ کوئی قابل توجہ مسئلہ نہیں ہے۔ اسی طریقے سے کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ ہمارے جسم میں جو جان (life) ہے‘ اس کے علاوہ روح نام کی بھی کوئی شے ہے۔ اس کی آج تک کوئی توثیق (verification) نہیں ہو سکی‘ لہٰذا اس مسئلہ کو چھوڑو۔ معقول طرزِ عمل یہی ہے کہ جو چیزیں موجود ہیں‘ ٹھوس ہیں‘ قابل تصدیق ہیں‘ ہمارے حواسِ خمسہ کے دائرے میں آتی ہیں اُن ہی پر توجہ مرتکز رکھو۔ لہٰذا طبیعیاتی عقل پرستی کا فارمولا یہ بنا کہ چونکہ اللہ ایک خیالی وتصوراتی چیز ہے جب کہ کائنات ایک حقیقت ہے‘ روح بھی ایک تصوراتی چیز ہے جب کہ مادہ اور جسم ایک ٹھوس حقیقت ہے‘ اور حیاتِ اُخروی بھی اسی قبیل کی شے ہے جب کہ حیاتِ دُنیوی ایک حقیقت ہے اور اس سے ہر وقت‘ ہر لمحہ اور ہر لحظہ سابقہ ہے‘ لہٰذا ماورائے حواس اور خیالی وتصوراتی باتوں پر غور کرنا وقت کا زیاں ہے۔ اس کے بجائے ہماری توجہات کا ارتکاز اُن چیزوں پر ہونا چاہیے جو ٹھوس ہیں‘ نگاہوں کے سامنے ہیں‘ حواس کی گرفت میں آنے والی ہیں‘ قابل توثیق ہیں اور جن سے ہمیں ہر دم واسطہ پڑتا ہے۔ یہ ہے اصل میں اِس دَور کی جاہلیّت‘ یعنی جاہلیّتِ جدیدہ کا صغریٰ کبریٰ۔

جاہلیّتِ جدیدہ کا ذکر قرآن میں

اس موقع پر میں آپ سے یہ عرض کر دوں کہ یہ نہ سمجھئے کہ یہ بالکل نئی جاہلیّت ہے۔ دبے دبے انداز میں ایک محدود پیمانے پر الحاد و مادہ پرستی پر مشتمل یہ جاہلیّت‘ جس کے لیے موزوں ترین لفظ ''دہریت'' استعمال کیا جا سکتا ہے‘ بعثتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت بھی موجود تھی۔ میں حیران ہوں کہ قرآن مجید میں ایک ہی جملہ میں اُس قلیل گروہ کے فلسفہ دہریت کو اس طور سے بیان کر دیا گیا ہے کہ دورِ جدید کی ہر نوع کی جاہلیّت اور دہریت کی طرف بھی اس میں واضح اشارات موجود ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے‘ جس کے متعلق نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس میں پچھلے زمانے کی خبریں بھی ہیں اور آنے والے زمانے کی بھی۔ تو قرآن کا یہ ایک جملہ دہریت والحاد کے تمام مکاتیب فکر کی نمائندگی کرتا ہے:

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ (الجاثیہ:۲۴) اس مکتبِ فکر کا قول نقل فرمایا گیا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یعنی ہم نہیں مانتے کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ پھر یہ کہ ایسی کوئی بالاتر طاقت یا ہستی نہیں ہے جس کے فیصلے سے ہمارا یہ مرنا اور جینا ہو رہا ہو۔ ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی زندہ ہوتے ہیں...... جبکہ قرآن مجید میں اس کے بالکل برعکس حقیقت بیان ہوتی ہے: ﴿يُحْيِي وَيُمِيْتُ﴾ ''وہ (اللہ) ہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت دیتا ہے''۔ یہ کارگاہِ موت وحیات اُسی کی تخلیق ہے۔ ﴿اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ﴾ ''وہی ہے جس نے موت اور زندگی کی تخلیق فرمائی''۔ لیکن یہاں نسبت اپنی طرف ہے: ﴿نَمُوْتُ وَنَحْيَا﴾ ''ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں''۔ ﴿وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾ ''اور ہمیں ہلاک کرنے والی چیز بھی سوائے گردشِ افلاک کے اور کچھ نہیں''۔ ایک نظام رواں دواں ہے۔ کچھ قوانین طبیعیہ (Laws of Nature) ہیں جن کے تحت اس کائنات کا کارخانہ چل رہا ہے۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں‘ جیتے ہیں‘ مرتے ہیں۔ کسی بالاتر طاقت اور موت کے بعد دوبارہ وجود اور کسی دوسری زندگی کو ہم نہیں مانتے......!

بتایئے کہ اِس دَور کی جدید جاہلیّت اس سے آگے اور کہاں جائے گی؟ بلکہ آج کے دور کے سائنٹیفک ذہن رکھنے والے لوگ تو پھر بھی محتاط الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ باتیں حقیقت رکھتی ہیں یا نہیں! ہم کوئی حتمی حکم نہیں لگا سکتے کہ اللہ ہے یا نہیں!

آخرت ہے یا نہیں! اس طرح سے وہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ برٹرینڈرسل اس دَور کے عظیم ترین اور نہایت مسلّمہ فلسفیوں میں سے تھا اور اس نے الحاد و مادیت اور دہریت کے فلسفے کا پرچار اور اللہ' آخرت' روح اور اخلاق کا ابطال جس بڑے پیانے پر اور جس مقبولِ عام اور دلنشین اسلوب وانداز سے کیا ہے' اس کا صحیح اندازہ ہم کو نہیں ہے۔ اس نے ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت کے اذہان کو مغلوب کر رکھا ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی سورۃ الجاثیہ کی ایک آیت کے ابتدائی حصے کے حوالے سے بیان کیا ہے' اس نوع کی جاہلیّت کے جراثیم اگرچہ وہاں بھی موجود تھے' لیکن اُس دور میں ایسے مسخ شدہ ذہنیت والے دانشور آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ وہاں جو غالب جاہلیّت تھی اسے میں جاہلیّت قدیمہ کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی اللہ کو ماننے کے ساتھ جھوٹے معبودوں کا اقرار اور اُن کی پوجاپاٹ' اور آخرت کو ماننے کے ساتھ شفاعتِ باطلہ کا تصور وعقیدہ —— جس پر قرآن میں نہایت واضح اور نمایاں انداز میں بحث کر کے اُس کا پوری طرح سے ابطال کیا گیا ہے۔ البتہ جاہلیّتِ جدیدہ کا معاملہ چونکہ وہاں بہت کم تھا لہٰذا اس پر قرآن مجید میں بحث اس انداز میں نہیں ہے جس طرح جاہلیّت قدیمہ کے ضمن میں کی گئی ہے۔ لیکن اس معاملے میں بھی قرآن حکیم بھرپور رہنمائی فراہم کرتا ہے اور یہ رہنمائی اُن باصلاحیت' باہمت اور ذہین لوگوں کے لیے ہے جو کمر کس لیں اور پھر قرآن حکیم کی آیاتِ بیّنات میں غوطہ زنی کریں اور جدید اسلوب وانداز کے ساتھ اس کا ابلاغ واعلام کریں۔ اس لیے کہ زمانہ اور اس کے تقاضے بدل گئے ہیں' جن اصطلاحات میں لوگ بات سمجھتے ہیں وہ اصطلاحات بدل گئی ہیں۔ اگر آپ بہترین اور مسکت بات کہیں گے لیکن قدیم اصطلاحات میں کہیں گے تو یہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کے لیے استدلال آپ کو جدید اصطلاحات میں ڈھال کر پیش کرنا ہوگا۔ پھر یہ کہ اس جاہلیّت جدیدہ کے لیے اس دَور میں جو عقلی مواد فراہم کیا گیا ہے' اس کے ابطال کے لیے آپ کو عقلی دلائل لانے ہوں گے۔ اگرچہ ان تمام کاموں کے لیے اصل تلوار قرآن ہی کی استعمال ہوگی' لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس میدان میں سخت محنت کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے قرآن حکیم میں غوطہ زنی کرنی ہوگی جس کے لیے کچھ نوجوانوں کو اپنی پوری پوری زندگیاں وقف کرنی ہوں گی۔

جاہلیّتِ جدیدہ کے لامحدود گوشے

جاہلیّتِ قدیمہ کے برعکس جاہلیّت جدیدہ کئی گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ بے خدا سائنس اور فکر وفلسفہ کی جولانگاہیں لامحدود ہیں۔ اس دور میں علم الحیاتیات اور علم الحیوانات کی طرح کی "Physical Sciences" بھی ہیں' پھر "Social Sciences" بھی ہیں' جن کا دائرۂ کار وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ اور یہ بات جان لیجیے کہ ڈارون کا فلسفۂ ارتقاء اب صرف حیاتیات کے میدان تک محدود نہیں رہا ہے' اس نے انسان کی معاشرتی اقدار اور تمدنی وتہذیبی فکر' حتیٰ کہ فلسفۂ اخلاقیات تک کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور یہ فلسفہ انسان کو محض ایک ترقی یافتہ حیوان کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس فلسفہ نے حیوانی شہوات و داعیات کی تسکین کے لیے انسان کو حیوانات کی طرح کھلا لائسنس دے دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس زہر کا تریاق فراہم کرنا ہوگا۔ پھر ماہرین نفسیات نے نفسیات (Psychology) کے میدان میں جو گُل کھلائے ہیں اور جس طرح کی گمراہیاں پھیلائی ہیں' ان سب کا ابطال کرنا ہوگا۔ اس میدان میں سب سے بڑی گمراہی فرائیڈ کی پیدا کردہ ہے جس نے انسان کے تمام محرکاتِ عمل کو جنسی جذبے کے تابع قرار دے دیا ہے۔ اسی طرح عمرانیات (Socialogy) کے میدان میں جو بھی باطل اور گمراہ کن نظریات در آئے ہیں' ان سب کا توڑ کرنا ہوگا۔

مارکسزم (Marxism) اِس دَور کا سب سے مقبول فکر ہے جس کا صرف اذہان ہی پر نہیں' بلکہ دنیا کے قابل ذکر ممالک پر عملاً اس نظامِ فکر کا استیلاء وتسلط ہے۔ مارکسزم اور کمیونزم کے متعلق یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ مادیت ہی کا نقطۂ عروج ہے۔ مادیت (Materialism) ہی اپنی

انتہا کو پہنچ کر جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اور جیسے ڈارون کے نظریے نے اخلاقیات' معاشرت اور عمرانیات میں نفوذ کر رکھا ہے' اسی طرح مارکسزم کے نظریے نے انسان کی اخلاقی قدروں اور انسانی تہذیب کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس نے دین و مذہب کے عقائد کی بنیادیں ڈھا کر رکھ دی ہیں اور اپنے ماننے والوں کو مکمل طور پر دہریہ وملحد بنا کر رکھ دیا ہے۔ انسان کے ماورائی عقائد اور اخلاقی قدریں اس فکر ونظریہ کے تحت آ کر بالکل نیا رُخ اختیار کر گئی ہیں۔

الغرض اس تیسرے محاذ یعنی جاہلیّت جدیدہ کی کوکھ سے بہت سے فتنے جنم لے چکے ہیں۔ ان سب کے خلاف محاذ آرائی کرنی ہوگی۔ اس جاہلیّتِ جدیدہ کے ابطال کے لیے خود اِس کے اندر بہت سے محاذ کھولنے ہوں گے۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک کے مقابلے کے لیے ضرورت ہے کہ چند باصلاحیت نوجوان اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ باہمت' محنتی اور کام میں غرق ہو جانے والے ہوں۔ ایسے نوجوانوں کے لیے نبی اکرم ﷺ کی بشارت ہے: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) ''تم میں سے بہترین انسان وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں''۔ قرآن حکیم کے معارف وحِکم سے خود بھی بہرہ مند ہوں اور خلق خدا کو بھی مستفید کریں۔

جاہلیّتِ قدیمہ کا ابطال' جیسا کہ میں نے عرض کیا' محض ترجمۂ قرآن سے بھی ہو جائے گا' لیکن اس جاہلیّت جدیدہ کے ابطال اور اس کی بیخ کنی کے لیے قرآن حکیم میں غور وتدبر کرنا ہوگا اور اس کے معانی ومفاہیم کے جواہر کی بازیافت کے لیے قرآن کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زنی کرنی ہوگی۔

ایک طویل حدیث میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' قرآن حکیم کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں:

((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ))

''علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہوسکیں گے' نہ کثرت وتکرارِ تلاوت سے اس کے لطف وتاثیر میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم ومعارف) کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا''۔

قرآن مجید کی یہ تین شانیں جو نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث میں بیان فرمائی ہیں' ان میں سے آخری شان میری اس گفتگو سے بہت زیادہ متعلق ہے۔ ایک ہیرے کی کان کا تصور کیجیے' جس میں کارکن لگے ہوئے ہیں اور ہیرے برآمد کر رہے ہیں۔ لیکن ایک وقت ایسا آ کر رہتا ہے کہ کان خالی ہو جاتی ہے اور ہیرے دستیاب نہیں ہوتے۔ لیکن قرآن ایسی معدن' ایسی کان نہیں ہے کہ جس کے متعلق کبھی یہ کہا جا سکے کہ حکمت کے موتی اب اس میں سے مزید نہیں نکل سکتے۔ قرآن تو اُس اتھاہ سمندر کے مانند ہے کہ انسان اس کی جتنی گہرائیوں میں جائے گا اتنے ہی اعلیٰ دُرِّ شہوار نکال کر لائے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیش جاری وساری رہے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ قرآن کی حکمت کے سمندر میں غوطہ زنی ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس بحر کی گہرائیوں سے حِکم ومعارف کے موتی نکال لانے کے لیے جان گسل کوشش اور پتا مار کر محنت کرنا ہوگی۔ لہٰذا ذہین و باصلاحیت اور دولتِ ایمانی کے حامل حضرات کو اس بحرِ زخّار کی غواصی سے ہر دَور کے تمام باطل نظریات اور خدا ناآشنا افکار کے ابطال کے لیے نہایت محکم دلائل اور قاطع براہین ملتے رہیں گے' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ)) پس اس دوسرے محاذ پر یعنی جاہلیّت جدیدہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھی ہمیں قرآن کی شمشیرِ برّاں ہاتھ میں لے کر مورچہ لگانا ہوگا۔

محاذِ سوم

بے یقینی

ہمارے معاشرے میں معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو بحمداللہ شعوری سطح پر جاہلیّت قدیمہ اور جدیدہ دونوں سے بچے ہوئے ہیں' لیکن ان کی بیماری ایک تیسری نوع کی بیماری ہے اور وہ ہے بے یقینی کی بیماری۔ یعنی مثبت طور پر جو یقین ہونا چاہیے انہیں وہ میسر نہیں ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ محض منفی چیزوں سے اگر آپ نے خود کو بچا بھی لیا تو اس سے آپ کے اخلاق و کردار پر اور آپ کی زندگی کے رُخ پر کوئی فیصلہ کن اثر مترتب نہیں ہو سکتا جب تک کہ مثبت طور پر یقین نہ ہو۔ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ کے درس کے ضمن میں مَیں نفاق اور ایمان کے بارے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ان دونوں کو یوں سمجھئے کہ نفاق ایک منفی قدر (minus value) ہے اور ایمان ایک مثبت قدر (plus value) ہے۔ پھر اس مثبت قدر میں درجہ بدرجہ اضافہ ہوتا ہے۔ ایک میرا اور آپ کا ایمان ہے' ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' عشرہ مبشرہ اور بالخصوص انبیاء و رُسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ایمان ہے۔ تو یوں سمجھ لیجیے کہ یہ معاملہ لامحدود درجے (plus infinity) تک چلتا جائے گا۔ اسی طرح نفاق کا معاملہ ہے۔ اس کا ایک نقطۂ آغاز بھی ہے اور اس کا تیسرا درجہ بھی ہے' جہاں پہنچ کر یہ ٹی بی کے مرض کی طرح لاعلاج ہو جاتا ہے۔ نفاق اور ایمان کے مابین ایک اور مقام ہے جسے میں ''zero level'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ میں نے جس تیسرے طبقے کا ذکر کیا ہے' بدقسمتی سے اس کی اکثریت اسی سطح پر کھڑی ہے۔ یعنی کوئی منفی چیز بھی نہیں ہے' نہ جاہلیّت قدیمہ ہے نہ جاہلیّتِ جدیدہ —— کم از کم شعوری سطح پر نہیں ہے —— لیکن مثبت طور پر یقینِ محکم والا ایمان بھی نہیں ہے اور اس کی طرف کوئی پیش قدمی بھی نہیں ہو رہی۔ تو ضرورت اسی یقینِ محکم اور ایمانِ کامل والے ایمان کی ہے' جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ایمان جب یقین کی شکل اختیار کرے گا جب ہی تو اس میں ایک قوت پیدا ہوگی! جب ہی وہ شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالے گا اور پوری شخصیت کی کایا پلٹ دے گا!

سورۃ الحجرات ہی کی آیت ۷ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک بہت محبوب کر دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں کے اندر مزین کر دیا ہے''۔ نورِ ایمان نے تمہارے دلوں کو منور کر دیا ہے۔ یہ ایمان اللہ کے فضل و کرم سے تمہارے دلوں میں راسخ اور جاگزیں ہو گیا ہے۔ جب تک یہ کیفیت نہ ہو' ایمان کے اثرات انسان کے سیرت و کردار' معاملات اور عملی رویے پر مترتب نہیں ہوں گے۔ اب اس بے یقینی کا علاج کہاں سے لایا جائے؟ اس کا دارو کہاں ملتا ہے؟

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اسی قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات ہی سے اس بے یقینی کا علاج ہوگا۔ بقول مولانا ظفر علی خان مرحوم:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئے دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

یقین والے ایمان کا اصل ذریعہ (source) قرآن ہے۔ اگرچہ اس کا ایک ذریعہ اور بھی ہے' لیکن وہ ثانوی ہے۔ صاحب یقین کی صحبت سے بھی یقین والا ایمان پیدا ہوتا ہے ع ''صحبت صالح ترا صالح کند''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحبِ یقین کے قرب کی مثال ایسے ہے جیسے آگ کی ایک بھٹی دہک رہی ہو' آپ اس کے قریب جائیں گے تو حرارت آپ کو پہنچ کر رہے گی۔ یہ قانونِ طبعی ہے۔ برف کی سل کے پاس بیٹھیں گے تو برودت تو آپ سے آپ پہنچے گی۔ تو اگر کسی کے دل میں یقین والے ایمان کی شمع روشن ہے تو آپ اگر اُس کے قریب رہیں گے' اس کی صحبت سے فیض اٹھائیں گے تو آپ کو بھی یقین کی دولت ملے گی۔ لیکن میں اس کو ثانوی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمیں پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ وہ صاحبِ یقین کہاں سے آئے گا! تو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ ایسے صاحب یقین پیدا کرنے کا واحد ذریعہ بھی قرآن حکیم ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت میں یہ دوں گا کہ دنیا کے سب سے عظیم صاحبِ یقین' جن سے بڑا کوئی صاحبِ یقین ہو ہی نہیں سکتا' خاتم النبیین' سید المرسلین حضرت محمدﷺ ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الشوریٰ کی آخری سے پہلی آیت یعنی آیت ۵۲ میں نبی اکرمﷺ کے ایمان و یقین کا تجزیہ کر کے بتا دیا گیا کہ حضورﷺ کو ایمان و یقین کہاں سے ملا! ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾﴾

''اور (اے نبیؐ!) اسی طرح ہم نے اپنے امر سے ایک روح (یعنی یہ قرآن مجید) آپؐ کی طرف وحی کیا ہے' (اس سے پہلے) آپؐ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے! لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اور (اب جبکہ آپﷺ حاملِ قرآن بن گئے تو) آپؐ یقیناً نوعِ انسانی کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیں گے''۔

نورِ وحی سے قبل حضورﷺ کے ایمان کی ماہیت:

یہاں مجھے تھوڑی سی وضاحت کرنی ہوگی' مبادا مغالطہ ہو جائے۔ یہاں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضورﷺ وحی کے نزول سے قبل مؤمن نہیں تھے؟ اسی نوع کی ایک بحث ہمارے یہاں حضورﷺ کے آباء و اجداد کے بارے میں بھی چلتی ہے کہ کیا جناب عبداللہ' جناب عبدالمطلب' جناب آمنہ کو ہم کافر یا مشرک کہیں گے؟ یہ بحثیں عوامی سطح پر ہوتی ہیں اور اس میں بڑی جذباتیت آ جاتی ہے۔ تو جان لیجیے کہ قرآن مجید ہمیں سورۃ النور کی آیاتِ نور کے ذریعے یہ بتاتا ہے کہ نورِ ایمان کے دو اجزائے ترکیبی ہیں' ایک نورِ فطرت اور ایک نورِ وحی۔ نورِ فطرت کی مثال صاف شفاف روغن کی ہے جو گویا بھڑکنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے چاہے دیا سلائی ابھی اس کے قریب نہ آئی ہو' جیسے پٹرول۔ تو درحقیقت انسان کی فطرت میں ایمان کا نور بالقوہ

(potentially) موجود ہوتا ہے‘ البتہ اس پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کے وہ پردے اتنے دبیز اور بھاری ہوتے ہیں کہ اٹھائے نہیں اٹھتے۔ نورِ وحی بھی آ کر اُن لوگوں کے ان پردوں کو چیر کر دل کے اندر موجود نورِ فطرت کے روغن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسے لوگ نورِ ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس وہ شخص جس کے قلب پر کوئی حجاب نہیں‘ یعنی سلیم الفطرت اور سلیم القلب انسان‘ (جیسا کہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ (الصّٰفّٰت) تو اس کے پاس جیسے ہی نورِ وحی آتا ہے تو یوں سمجھئے جیسے کہ آئینے کے سامنے روشنی آ گئی۔ لہٰذا نورِ وحی سے اس کا آئینۂ قلب جگمگا اٹھتا ہے۔ تو یہ ہے مثال نورِ فطرت اور نورِ وحی کی۔ اسی کو سورۃ النور میں نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم یوں کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک میں ایمان بالقوہ یا dormant form میں تو موجود تھا‘ لیکن اس کو تحریک وحی سے ملی‘ وحی نے اسے متحرک کیا‘ اسے actualise کیا۔ یہ ہے مفہوم ان الفاظِ مبارکہ کا: ﴿مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ج﴾

سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات جن کے متعلق صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہ آیات حضور ﷺ کو شبِ معراج میں اُمت کے لیے بطور تحفۂ خاص عطا ہوئی تھیں‘ ان میں سے پہلی آیت میں قرآن حکیم پر پہلے خود نبی اکرم ﷺ کے ایمان لانے کا ذکر ہے اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان لانے کا:
﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط﴾

دلکش ترین ایمان کس کا ہے؟

اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی ایک بڑی پیاری حدیث مشکوٰۃ شریف کے آخری باب: باب ثواب هٰذهِ الاُمّة میں امام بیہقیؒ کی ''دلائل النبوۃ'' کے حوالے سے آئی ہے۔ اس حدیث کو حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں۔ چشمِ تصور سے دیکھئے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں رونق افروز ہیں۔ آپ صحابہؓ سے سوال کرتے ہیں: ((اَيُّ الْخَلْقِ اَعْجَبُ اِلَيْكُمْ اِيْمَانًا)) ''مجھے بتاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟'' اعجب‘ عجیب سے اسم تفضیل ہے۔ اردو میں عجیب کا لفظ حیران کن یا غیر معمولی بات کے لیے مستعمل ہے‘ لیکن عربی میں عجیب دل کو لبھانے والی شے کو کہتے ہیں‘ یعنی دلکش اور دل خوش کن چیز۔ سورۃ الاحزاب میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ﴾ ''اور چاہے ان کا حسن آپؐ کے دل کو کتنا ہی لبھانے والا کیوں نہ ہو''۔ سورۃ المنافقون میں ارشاد ہوا: ﴿وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ﴾ ''اور جس وقت آپؐ ان کو دیکھتے ہیں تو اُن کے بدن آپ کو خوش لگتے ہیں''۔ تو حضور ﷺ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا کہ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ دلکش‘ دل کو لبھانے والا اور حسین ایمان کس کا ہے؟ یہ بھی حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: ''فرشتوں کا''۔ حضور ﷺ نے اس کو ردّ فرما دیا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ)) ''وہ ایمان کیسے نہیں لائیں گے جبکہ وہ اپنے ربّ تعالیٰ کے پاس ہیں!'') ان کے لیے تو غیب کا پردہ حائل نہیں ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس میں کون سا کمال ہے؟ پھر صحابہؓ نے عرض کیا: فَالنَّبِيُّوْنَ ''پھر نبیوں کا ایمان ہے!''

حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ)) ''وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے جبکہ اُن پر وحی نازل ہوتی ہے!'' انبیاء علیہم السلام پر اللہ کا فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے‘ انہیں غیب کی خبروں سے مطلع کرتا ہے‘ پھر اللہ ان کو اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کراتا ہے۔ لہٰذا وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے اور ان کا ایمان ''اعجب'' کیسے ہوگا! تیسری بار صحابہ کرامؓ نے بڑی ہمت و جرأت کر کے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا:

''فَنَحْنُ'' ''پھر ہم ہیں''۔ ہمارا ایمان اعجب ہے۔ حضورﷺ نے اس کو بھی ردّ فرمادیا: ((وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ)) ''تم کیسے ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں''۔ یعنی اللہ کی سب سے بڑی نشانی اور اس کا سب سے بڑا معجزہ تمہارے سامنے ہے۔ تم کو میرے دیدار اور میری صحبت کا فیض حاصل ہے۔ میری ذات سے جن برکات کا ظہور اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا جو نزول ہو رہا ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ انتہائی قلیل تعداد اور بے سروسامان ہونے کے باوجود اللہ کی نصرت و تائید سے تمہیں مشرکین و کفار پر جو فتوحات حاصل ہو رہی ہیں' ان کا تم اپنی چشم سر سے ہر لحہ مشاہدہ کرتے ہو۔ میں نے بنفسِ نفیس تمہیں توحید کی دعوت پہنچائی ہے' تم پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اس کے معارف وحکم کی تبیین کی ہے' تو تم کیسے ایمان نہ لاتے! اب حضورﷺ خود جواب ارشاد فرماتے ہیں: ((اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَيَّ اِيْمَانًا لَقَوْمٌ يَكُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ)): ''میرے نزدیک تو سب سے زیادہ دلربا' دلکش اور حسین ایمان اُن لوگوں کا ہوگا جو میرے بعد ہوں گے'' ((يَجِدُوْنَ صُحُفًا فِيْهَا كِتَابٌ)) ''ان کو تو اوراق ملیں گے جن میں ایک کتاب (قرآن مجید) درج ہوگی''۔ ((يُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِيْهَا)) ''وہ اس پر ایمان لائیں گے جو کچھ اُن اوراق میں ہوگا''۔ یعنی وہ نہ میرے دیدار سے شاد کام ہوئے' نہ انہوں نے میری صحبت سے فیض اٹھایا' نہ انہوں نے ان برکات' معجزات' نزولِ رحمت اور نصرتِ الٰہی کا بچشم سر مشاہدہ کیا' لیکن وہ اس قرآن پر ایمان لانے کے ذریعے سے ان تمام حقائقِ کونیہ وتشریعیہ پر ایمان لائیں گے جو میں لے کر آیا ہوں۔

اس مقام پر ایک اہم بات کی وضاحت ضروری ہے۔ یہاں افضلیت کی بات نہیں ہو رہی۔ انبیاء کے بعد افضل ترین ایمان لاریب صحابہ کرامؓ ہی کا ہے۔ یہاں حسین ودلکش ایمان کی بات ہو رہی ہے' ان کے ایمان کی جنہوں نے نہ اللہ کی سب سے عظیم نشانی یعنی نبی اکرمﷺ کے چہرۂ انور کا دیدار کیا اور نہ دنیا کے عظیم ترین مربی ومزکی کی صحبت سے مستفیض ہوئے' لیکن انہوں نے نورِ ایمان قرآن مجید سے حاصل کیا جو درحقیقت منبع و سرچشمۂ ایمان ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نور قرار دے رہا ہے: ﴿جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط﴾ تو ایک سند قرآن مجید سے اور ایک سند حدیث شریف سے کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ بے یقینی کے اس روگ کا واحد علاج قرآن حکیم ہی ہے۔ یہی بے یقینی کو ختم کرنے والی واحد تلوار ہے۔ چنانچہ ''بے یقینی'' کے خلاف بھی ''جہاد بالقرآن'' کرنا ہوگا۔ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں!

محاذِ چہارم:

نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات

اس دور میں نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات کا محاذ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں عام لوگوں کی نفس پرستی اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ اس کا سبب تو وہی ہے جس پر جاہلیّتِ قدیمہ' جاہلیّتِ جدیدہ اور بے یقینی کے محاذوں کے ضمن میں گفتگو کے دوران اشارات ہو چکے ہیں' اور پھر اس نفس پرستی کا تعلق زیادہ تر افراد کی اپنی ذاتی زندگی سے ہے' لیکن ہمارے یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے اسے باقاعدہ ایک منظّم ادارے (institution) کی شکل دے رکھی ہے اور کلچر اور ثقافت کے نام پر منکرات وفواحش کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ایک مسلمان کے دل میں اباحیت اور منکرات سے جو بُعد اور نفور ہوتا تھا اور حرام چیزوں کے خلاف دل میں جو جذبۂ نفرت ہوتا تھا اسے ثقافتی طائفوں' ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں' راگ ورنگ کی محفلوں اور تعلیمی' کاروباری' دفتری اور صنعتی اداروں میں مرد وزن کے مخلوط طریقِ کار کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اس سارے نظام کو ایک طرف اباحیت پسند طبقے اور دوسری طرف خود سرکاری سطح پر سرپرستی حاصل ہے۔ اس کو تہذیب' ثقافت' فنونِ لطیفہ اور مرد وزن کی مساوات کے خوشنما نام دیے گئے ہیں۔ اب بے پردگی' نیم عریانی' خواتین کی رنگین ومزین تصاویر کو تہذیب وتمدن کی ناگزیر ضرورت قرار دیا گیا ہے اور اس طرح عورت کو

چراغِ خانہ سے شمع محفل اور اس سے بڑھ کر اشتہاری جنس بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ہمارے اخبارات و رسائل (اِلاّ ماشاءاللہ) اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس میں مسابقت کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں' اس کو وقت اور زمانے کا تقاضا سمجھ لیا گیا ہے۔ دین تو رہا ایک طرف' ہماری جو معاشرتی' تہذیبی اور مجلسی اقدار تھیں' ان سب کو بھی پائمال کیا جا رہا ہے۔

جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ اگرچہ اقلیت پر مشتمل ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کا ذرائع ابلاغ پر پوری طرح غلبہ اور تسلط ہے۔ اس اقلیتی گروہ نے کچھ وقتی تقاضوں اور کچھ لوگوں کے دینی رجحان کے پیش نظر ان ذرائع ابلاغ کا کچھ حصہ اسلامی اور دینی پروگراموں کے لیے بھی مخصوص کر رکھا ہے جو اکثر و بیشتر محض بہلاوے اور دکھاوے کے لیے ہوتے ہیں' اور بڑی چابک دستی' ہوشیاری اور احتیاط یہ برتی جاتی ہے کہ کہیں کوئی ایسا کام نہ ہو جائے کہ ان ذرائع ابلاغ سے عوام الناس تک دین کا حقیقی پیغام پہنچ جائے۔ مبادا اعجازِ قرآنی لوگوں کے اذہان وقلوب میں نفوذ کر کے ان کو مسخر کر لے۔ یہ وہی خوف ہے جس کا اظہار علامہ اقبال مرحوم نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ابلیس کی زبان سے اس طرح کرایا ہے ؎

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں!

لہٰذا سرکاری ذرائع ابلاغ میں دین و مذہب کے نام سے جو پروگرام رکھے جاتے ہیں یا اخبارات و رسائل میں جو صفحات مختص کیے جاتے ہیں ان میں بظاہر احوال کوشش یہ ہوتی ہے کہ غیر محسوس طریقے سے انتشار (confusion) کو ہوا دی جائے۔ چنانچہ کوئی مشرق کی بات کہتا ہے تو کوئی مغرب کی بات لکھتا ہے۔ کوئی شمال کی بات کہے گا تو اگلا جنوب کی بات کرے گا' تاکہ دین و مذہب کے بارے میں نفسیاتی الجھاؤ اور ذہنی انتشار بڑھتا چلا جائے۔ پھر بالفرض کوئی مؤثر بات آ ہی جائے تو فوری طور پر اس کے متصلاً بعد کچھ ایسے پروگرام رکھ دیے جائیں گے جن کے ذریعے یہ اثرات زائل ہو جائیں' ذہن سے محو ہو جائیں' یعنی ع

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب

پھر ان تمام ذرائع ابلاغ و وسائلِ ابلاغ کے کرتا دھرتا اُن خواتین کے بیانات' مضامین' انٹرویوز' تصاویر اور خبروں کو انتہائی نمایاں کرتے ہیں جو مغرب زدہ اور اباحیت پسند ہیں اور ہمارے ملک میں انتہائی اقلیت میں ہیں۔ لیکن تأثر یہ دیا جاتا ہے کہ گویا ہمارے ملک کی خواتین کی اکثریت اسی طرزِ فکر کی حامل خواتین کی ہے جن کے نزدیک دین و مذہب اور ہماری تہذیب و معاشرتی اقدار پرکاہ کے برابر بھی وقعت اور حیثیت نہیں رکھتیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی عظیم اکثریت ان دین پسند خواتین پر مشتمل ہے جن کے نظریات ان مغرب زدہ خواتین کے نظریات کے بالکل برعکس ہیں۔ لیکن معاملہ چونکہ یہ ہے کہ ع ''ولیکن قلم در کفِ دشمن است'' لہٰذا خواتین کے اس قلیل ترین طبقے کو وسائلِ ابلاغ کے ذریعے اس طرح project اور نمایاں کیا جاتا ہے گویا پاکستان میں بسنے والی تمام خواتین اسی نظریہ وخیال کی حامی ہیں۔ یہ ہے اس جہاد کا چوتھا محاذ۔ اب سوال یہ ہے کہ اس محاذ پر ہم کیا کر سکتے ہیں!

کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

ان ذرائع ابلاغ سے معاشرے میں نفس پرستی کا جو نفوذ ہو رہا ہے اور انسان کی سوچ اور رجحانات و میلانات کو جس طرح غلط رُخ پر ڈالا جا رہا ہے اس سے مقابلے کے لیے بھی ہمارے پاس ڈھال اور تلوار قرآن ہی ہے۔ میں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عزم کو بہت عام کیا ہے جس کا حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علماء کے ایک اجتماع میں اظہار کیا تھا:

''میں وہیں (مراد ہے اسارتِ مالٹا) سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے......''

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے علمائے حقانی و ربانی جو اپنا تعلق امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہما اللہ سے قائم کرنے کو اپنے لیے موجب اعزاز و افتخار سمجھتے ہیں' وہ فقہی و کلامی تعبیر اور استنباط کی بحثوں سے صرفِ نظر کر کے ایک منظّم تحریک کی شکل میں حضرت شیخ الہندؒ کے عزم کو عملی شکل دینے کے لیے کمر ہمت کس لیں۔ شہر شہر' محلّہ محلّہ' کوچہ کوچہ' قریہ قریہ عوامی درسِ قرآن کے حلقے قائم کریں اور قرآن مجید' فرقانِ حمید کی شمشیر برّاں کے ذریعے نفس پرستی اور اباحیت پسندی کے خلاف جہاد کریں اور اس سیلاب کے آگے سدِّ ذوالقرنین بن جائیں۔ یہی پیغام اس مردِ قلندر نے آج سے قریباً نصف صدی قبل دیا تھا جس کو بجا طور پر حکیم الاُمت کہا جاتا ہے' یعنی ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم و مغفور۔ ان کا پیغام تھا۔

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم   تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم!

در جہاں اسرارِ دیں رافاش کن   نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن!

''اے وہ شخص جسے حاملِ قرآن عظیم ہونے پر فخر ہے' آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دبکے رہو گے؟ اٹھو اور دنیا میں دینِ حق کے اسرار و رموز اور عرفان و فیضان کو عام کرو اور شریعت اسلامی کے حکم و عبر کی نشر و اشاعت کے لیے سرگرم عمل ہو جاؤ!''

یہ ہے علامہ مرحوم کا پیغام حاملِ قرآن اُمت اور بالخصوص علمائے حق کے لیے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ملک کا کوئی قابلِ ذکر شہر ایسا نہیں ہے جس میں غالب اکثریت ایسے علمائے کرام کی نہ ہو جن کا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ یا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین جیسے اکابر سے ارادت و عقیدت کا تعلق نہ ہو۔ آخر الذکر بھی درحقیقت ولی اللّٰہی اور دیوبند کے مکتبِ فکر سے وابستہ رہے ہیں اور تھانوی مکتبِ فکر ہو یا ندوی' یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں۔ اسی طرح مسلکِ سلفی کا تعلق تو براہِ راست حضرت شاہ اسماعیلؒ جیسے غازی و مجاہد اور شہید اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے قائم ہے۔ اگر ہمارے یہ علماءِ عظام منظّم ہو کر عوامی درسِ قرآن کی تحریک برپا کر دیں تو ان شاء اللہ العزیز نفس پرستی' اباحیت پسندی اور خدا ناآشنا ثقافت و فنونِ لطیفہ کے نام سے جو زہر ہمارے معاشرے میں پھیلایا جا رہا ہے اس کا سدّباب بھی ہو جائے گا اور جیسے جیسے قرآن حکیم اُمت کے اذہان و قلوب میں نفوذ اور سرایت کرے گا تو نتیجتاً ذرائع ابلاغ پر قابض اباحیت پسند قلیل طبقہ یا تو اپنا رویہ تبدیل کرنے پر یا اسلام کے سچے خادموں کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ البتہ اس کے لیے ناگزیر شرط یہ ہے کہ تمام انواع کے فقہی و کلامی اختلافات و تأویلات سے دامن بچایا جائے اور قرآن حکیم کا انقلابی پیغام عامۃ الناس تک پہنچایا جائے۔ اگر اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو ابلیس کا وہ مشورہ کارگر ہو گا جو اُس نے اپنی شوریٰ میں بقول علامہ اقبال پیش کیا تھا کہ ۔

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے   یہ کتاب اللہ کی تأویلات میں اُلجھا رہے

ذہن و فکر کی تطہیر اور سیرت و کردار کی تعمیر کی اساس اور نفس پرستی کے سیلاب کے آگے کوئی چیز اگر سدّ اور بند بن سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔ اباحیت و نفس پرستی کے قلع قمع کے لیے اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی تیغ بے زنہار ہے تو وہ قرآن مجید ہے۔ علامہ اقبال کے یہ اشعار میں نے بارہا آپ کو سنائے ہیں۔ انہیں پھر پیش کر رہا ہوں۔ یہ اشعار میرے مفہوم و مطلوب کو آپ کے اذہان و قلوب میں منتقل اور جاگزیں کرنے میں بہت ممد و معاون ہوں گے۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیر قرآنش کنی!

''ابلیس کو ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے' اس لیے کہ اس کا بسیرا نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ہے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ اسے قرآنِ حکیم کی حکمت وہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنالیا جائے''۔

واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری ملی وقومی زندگی کے شعور کی گہرائیوں میں آرٹ کونسلز' ثقافتی طائفوں کے مبادلوں' راگ و رنگ کی محفلوں' رومانی ڈراموں' افسانوں اور لٹریچر اور ٹیلی ویژن کے مختلف "Cultural Shows" نے ڈیرا لگا رکھا ہے۔ ہمارے ملک کی اعلیٰ ترین شخصیتیں اس میٹھے زہر کی سرپرستی کر رہی ہیں۔ ان سے نبرد آزما ہونا آسان کام نہیں ہے۔ بہتر شکل یہی ہے کہ قرآن کی تلوار سے ان اربابِ اختیار کو مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نفسانیت اور شہوانیت تو ہمارے نفس کے اندر ہی ہیں۔ شیطان ان نفسانی خواہشات و داعیات کو بھڑکاتا ہے' انہیں مشتعل کرتا ہے' اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتا۔ چنانچہ آخرت میں جب فیصلے چکا دیے جائیں گے تو جو لوگ دنیا میں شیطان کے دجل وفریب کا شکار ہوئے تھے وہ اس کو ملامت کریں گے۔ شیطان اس کا جو طویل جواب دے گا اُسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ ابراہیم میں نقل فرمایا ہے۔ اس جواب میں وہ کہے گا:

﴿وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ج فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ط﴾ (آیت۲۲)

''میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں' میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ تمہیں اپنے راستے کی طرف بلایا (اسے خوش نما' دلفریب اور تمہارے نفس کے لیے لذت آفریں بنا کر پیش کیا) تو تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ پس اب مجھے ملامت نہ کرو' بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری کوئی فریاد رسی کر سکتا (اور تمہارے کام آ سکتا) ہوں اور نہ ہی تم میری فریاد رسی کر سکتے (اور میرے کام آ سکتے) ہو۔''

معلوم ہوا کہ شیطان اپنے راستے کو بہت مزین کر کے انسان کو اس کی طرف بلاتا ہے' پھر انسان کے نفس میں' اس کے پورے وجود میں اس کی دعوت خوش نما زہر بن کر سرایت کر جاتی ہے۔ لہٰذا اس زہر کے لیے تریاق بھی وہ درکار ہے جو پورے وجود میں سرایت کر سکے اور پھر جس میں حلاوت اور تاثیر بھی ہو۔ ایسا کوئی تریاق سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں ہے ۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

''یہ قرآن اگر کسی کے اندر اتر جائے تو اُس کے باطن میں ایک انقلاب آ جائے' اور فرد کے اندر کا یہ انقلاب ایک بین الاقوامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے''۔

محاذ پنجم

فرقہ واریت

ہمارا پانچواں محاذ جس پر ہمیں جہاد بالقرآن کرنا ہے‘ وہ فرقہ واریت‘ تشتت‘ انتشار اور باہمی اختلافات کا محاذ ہے۔ یہ عناصر وحدتِ اُمت کو صدیوں سے دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ انہی کے باعث دولتِ عباسیہ ختم ہوئی اور سقوطِ بغداد کا سانحہ پیش آیا۔ انہی کی وجہ سے بغداد کے گلی کوچوں میں اہل سنت کے دوگروہ دست بگریباں ہوئے‘ تلواریں بے نیام ہوئیں اور خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ سلطنتِ ہسپانیہ کے زوال و انحطاط اور پھر کامل سقوط کے عوامل میں جہاں قبائلی عصبیتیں کارفرما تھیں وہاں اس تباہی میں فقہی و کلامی اختلافات کا عمل دخل بھی تھا۔ اور اب محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اختلافات سلطنتِ خداداد پاکستان کے لیے بھی روز بروز زیادہ سے زیادہ نازک اور خطرناک صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔

ماضی قریب میں بادشاہی مسجد کے ایک مبینہ واقعہ بلکہ محض افواہ پر معرکہ آرائی کی جو تکلیف دہ صورتِ حال بنی تھی‘ یہ چنگاری جنگل کی آگ بن سکتی تھی اور ہم میں سے ہر شخص اپنے طور پر اس کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ آگ ہمارے لیے کتنی ہولناک اور تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ فرقہ واریت کا بارود اب بھی ہمارے یہاں موجود ہے‘ کوئی شرپسند گروہ اس کو کسی وقت بھی دیا سلائی دکھا سکتا ہے۔ اس نازک صورت حال میں ہماری ملی و سیاسی زندگی اور ہمارے وطن کے مستقبل کے لیے جو خطرات مضمر ہیں‘ میں اس وقت ان کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ پھر یہ کہ فی الوقت صورتِ حال جس ہلاکت خیزی کے دہانے تک پہنچی ہوئی ہے اس کے اسباب و علل کے متعلق بھی میں اس وقت کچھ عرض نہیں کروں گا۔ اِس وقت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس کا علاج صرف تشویش ظاہر کرنے سے تو نہیں ہو جائے گا‘ محض پریشان ہونے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا! اس کے لیے مثبت کام کرنا ہوگا۔ اس کے لیے بھی جہاد کرنا ہوگا اور اس جہاد کے لیے بھی قرآن ہی واحد تلوار ہے۔

اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست:

فرقہ واریت کے اس عفریت کا سر قلم کرنے‘ اس کا قلع قمع کرنے اور اس کو نیست و نابود کرنے کے لیے واحد تلوار صرف قرآن ہے۔ یہی سبق ہم کو سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ابتدائی الفاظ میں ملتا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ تمام مفسرین اور تمام علماء عظام کا اس امر پر اجماع ہے کہ یہاں حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے اور یہ رائے متعدد احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں قائم کی گئی ہے۔ آیتِ مبارکہ کے اس حصے سے علامہ اقبال مرحوم نے جو کچھ اخذ کیا ہے وہ میں آگے بیان کروں گا۔ اس وقت میں اکبر الہ آبادی مرحوم کا ایک شعر سناتا ہوں جو ہمارے موجودہ حالات پر منطبق ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ع

صوم ہے ایمان سے‘ ایمان غائب صوم گم

یعنی آدمی روزہ تو ایمان ہی کے تقاضے کے تحت رکھ سکتا ہے۔ (خاص طور پر موسمِ گرما کے روزے) جب ایمان ہی نہیں رہا تو صوم تو آپ سے آپ گیا! پھر اس کا التزام و اہتمام کیسے ہوگا؟ اگلا مصرع نہایت قابل توجہ ہے ع

قوم ہے قرآن سے‘ قرآن رخصت قوم گم

مسلمانوں کی ملّی اور قومی شیرازہ بندی قرآن سے ہے۔قرآن درمیان سے ہٹ گیا یا آپ کی توجہ قرآن سے ہٹ گئی تو نتیجہ ایک ہی ہوا' یعنی وحدتِ ملّی کا شیرازہ بکھر گیا۔اسے اقبال نے اس طرح تعبیر کیا ہے ؏

یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد!

یعنی یا مسلمان مر چکا ہے یا (معاذ اللہ) قرآن مر چکا ہے۔اقبال دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآن تو زندہ و پائندہ ہے' لیکن مسلمانوں کی توجہ مر چکی ہے۔ قرآن سے ان کا شغف والتفات ختم ہو چکا ہے۔چنانچہ علامہ مرحوم نے مسلمانوں کو چونکانے کی غرض سے یہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔

عظمتِ قرآن کے بیان میں علامہ اقبال کے یہ اشعار بھی انتہائی قابل توجہ ہیں:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں　　زندہ و پائندہ و گویا ست ایں
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست　　عصر ہا پیچیدہ در آناتِ او ست

''اس قرآن کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اُسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں! حقیقت یہ ہے کہ یہ محض کتاب نہیں ہے' کچھ اور ہی شے ہے! یہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کا کلام ہے لہٰذا اُسی کی مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی۔اور یہ کتاب جیتی جاگتی اور بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی ہے۔اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں۔''

لیکن مسلمانوں کا اس کتابِ الٰہی' اس ''ھدًی للنّاس ''اس فرقانِ حمید' اس نسخۂ شفا کے ساتھ کیا سلوک وروّیہ باقی رہ گیا ہے' اس کا نوحہ اقبال اس طرح کرتے ہیں ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست!　　کہ از یٰسینِ او آساں بمیری!

''لیکن افسوس کہ اے مسلمان! تجھے اس قرآن کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۂ یٰسین کے ذریعے موت کو آسان کر لے''۔

علامہ کے یہ اشعار بھی میں بارہا اپنی تقریر وتحریر میں پیش کر چکا ہوں جن میں انہوں نے بڑی دل سوزی کے ساتھ ہماری ذلت وخواری' ہمارے انتشار' ہماری آپس کی چپقلش اور تنازعات کی تشخیص بھی کی ہے اور علاج بھی تجویز کیا ہے ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ　　در بغل داری کتابِ زندۂ

حضرت شیخ الہندؒ نے اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد پوری دنیا کے مسلمانوں کی دینی و دُنیوی تباہی و بربادی کا جہاں ایک سبب ''قرآن کو چھوڑ دینا'' قرار دیا تھا وہاں دوسرا سبب ''آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی'' بھی بیان کیا تھا۔عوامی درسِ قرآن کے حلقے قائم کرنے کے عزم کے ساتھ ساتھ آپ نے اس ارادہ کا اظہار بھی کیا تھا کہ مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو ختم کرنے کے کام میں بھی وہ اپنی باقی زندگی صرف کریں گے۔مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ جو اس روایت کے راوی ہیں' انہوں نے اس پر اس طرح تبصرہ فرمایا تھا کہ ''حضرتؒ نے ہمارے زوال وانحطاط کے جو دو سبب بیان کیے تھے' غور کیا جائے تو یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ہمارے باہمی اختلافات اور باہمی جنگ وجدال کا سبب بھی قرآن کو ترک کر دینا ہی ہے''۔ان دوا کابر کا اس پر کامل اتفاق نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح اور ان کے باہمی اختلاف کو ختم یا کم از کم ان کی شدت کو کم کرنے اور ان میں اعتدال پیدا کرنے کا واحد ذریعہ اعتصام بالقرآن ہے۔

علامہ اقبال نے اسے جس پُرشکوہ انداز میں ادا کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است　　پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است

ماہمہ خاک و دل آگاہ اوست　　اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملت کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے' ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا یہ وجود مٹی ہے! ہاں اس میں دل ہے' جس کی دھڑکن اس کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ (ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔) اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامو کہ یہی حبل اللہ یعنی اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔

اور فرماتے ہیں ؎

چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو

ورنہ مانند غبار آشفتہ شو

''اے ملتِ اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے آپ کو تسبیح کے موتیوں کی طرح قرآن کے رشتے میں بیندھ لے اور پرو لے' ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دُھول کی مانند پریشان و منتشر اور ذلیل وخوار رہ!''

میرا تاثر یہ ہے اور میں اسے تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی برملا ظاہر کرتا رہا ہوں کہ ماضی قریب میں قرآن کی عظمت اور مرتبہ ومقام کا انکشاف جس شدت کے ساتھ علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو۔ علامہ مرحوم نے اپنی شاعری بالخصوص فارسی شاعری میں نہایت دل گداز' مؤثر اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جانے والے مختلف اسالیب سے ملتِ اسلامیہ کو جھنجھوڑا ہے اور اسے دعوت دی ہے کہ دین و دنیا کی فوز وفلاح چاہتے ہو تو قرآن کو تھامو۔ یہی تمہارے اتحاد اور تمہارے عروج کا واحد ذریعہ ہے۔ ان کا یہ شعر آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن!

نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن!

''تو اگر مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے' اس کی تمنا اور آرزو رکھتا ہے تو اچھی طرح جان لے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیات کی بنیاد قرآن پر قائم کرے''۔

حاصل کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے سامنے پانچ محاذ ہیں جن کے خلاف منظّم ہو کر جہاد بالقرآن کے لیے کمر کسنے کی ضرورت ہے۔ آپ میں سے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اسی جہاد کے لیے میں نے اپنا پروفیشن تج دیا۔ میں اپنی زندگی کے بہترین دن اسی کام میں لگا چکا ہوں۔ اب تو بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہوں۔ ع ''شادم بر عمر خویش کہ کارے کردم''۔ الحمد للہ میری زندگی کے جو بہترین ایام تھے وہ اس جہاد بالقرآن میں بسر ہوئے ہیں۔ میرے شب و روز اور میری صلاحیتیں اور توانائیاں دروسِ قرآن' تقاریر' خطباتِ جمعہ' انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے قیام' قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کے انعقاد' قرآنی تربیت گاہوں کے انصرام' قرآنی سلسلۂ اشاعت کے انتظام' قرآن کے پیغام پر مشتمل مطبوعات کی اشاعت اور ملک کے مختلف شہروں کے دعوتی دَوروں میں لگی ہیں۔

اور الحمد للہ قرآن کا پیغام لے کر میں دوسرے ممالک میں بھی گیا ہوں۔ صنم خانۂ ہند' عالم عرب' امریکہ اور یورپ میں چراغ روشن کیے ہیں۔

لوگوں کو آمادہ کیا ہے کہ کمر کسیں اور اس جہاد بالقرآن کے لیے میدان میں آئیں۔ ظاہر بات ہے کہ کام کے نتائج ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے۔ آپ کے اسی شہر لاہور میں مَیں نے یہ کام چھ سال تن تنہا کیا' جبکہ کوئی ادارہ نہیں تھا' کوئی تنظیم نہیں تھی۔ مطب بھی کر رہا تھا اور یہ کام بھی کر رہا تھا۔ وہ جو حسرت موہانی نے کہا تھا ع ''ہے مشقِ سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی'' تو یہ دونوں چیزیں میرے لیے بھی جاری تھیں۔ پھر ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی اور بقول اقبال۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں

بہرحال میرا اور انجمن کا کام اسی جہاد بالقرآن کے گرد گھومتا رہا ہے۔ آج میں نے اس پورے کام کو پانچ محاذوں کی شکل میں مرتب کر کے آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا ہے' ورنہ یہ باتیں تو میں نے بارہا کہی ہیں۔ میں ان کو مختلف موضوعات وعنوانات کے تحت اور مختلف پیرایوں میں بیان کرتا رہا ہوں۔

آج مجھے آپ حضرات سے یہ کہنا ہے کہ رمضان المبارک کے جمعہ کی اس مبارک ساعت [(۱)] میں کچھ غور کیجیے' کچھ سوچیے' کچھ اپنے گریبانوں میں جھانکیے۔ میں عرض کروں گا کہ ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ معین (assess) کرے کہ میں قرآن کریم کے اعتبار سے کس مقام پر کھڑا ہوں۔ کیا میں قرآن پڑھتا ہوں؟ قرآن پر غور وتدبر کرتا ہوں؟ قرآن سے مجھے کتنا شغف اور تعلق ہے؟ پھر یہ کہ قرآن کا جو حکم سامنے آجائے کیا بے چون وچرا اُسے مان لیتا ہوں؟ کیا قرآن کے پیغام کو آگے پہنچانے کا کوئی ارادہ' کوئی عزم میرے اندر ہے؟ اس ضمن میں تن من دھن سے کوئی خدمت میں نے آج تک کی ہے؟ یہ خود احتسابی ضروری ہے۔ انسان پہلے خود اپنا جائزہ لے' پھر فیصلہ کرے کہ بحیثیت مسلمان اس کو قرآن مجید کے جو حقوق ادا کرنے ہیں' اس کام کے لیے اس کے دل میں کتنی لگن' تڑپ' ولولہ اور حوصلہ ہے! اگر نہیں ہے تو شعوری طور پر اس کے لیے کوشاں ہو۔ یہ بھی نہ کر سکے تو پھر اپنے ایمان کی خیر منائے۔

میں نے ۱۹۶۸ء میں ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ اس میں قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے۔ پہلا یہ کہ اسے مانا جائے۔ دوسرا یہ کہ اسے پڑھا جائے۔ تیسرا یہ کہ اُسے سمجھا جائے۔ چوتھا یہ کہ اس پر عمل کیا جائے اور پانچواں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ یہ تقریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ ان حقوق کے حوالے سے اپنا محاسبہ خود کیجیے کہ کیا ہم ان کو ادا کر رہے ہیں! اگر نہیں کر رہے ہیں تو آج ہی یہ عزم کر کے اٹھیے کہ ہم ان شاء اللہ ان حقوق کو ادا کریں گے۔

یہ بھی حسنِ اتفاق ہے کہ میں نے قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے اور آج میں نے پانچ ہی محاذ آپ کے سامنے رکھ دیے ہیں جو ہماری اپنی ملّت کی اصلاح اور اس کی دینی وملّی زندگی کو سنوارنے کے لیے جہاد بالقرآن کے متقاضی ہیں۔ یہ تو ہماری جدوجہد کا پہلا مرحلہ ہے۔ ہمیں تو اس قرآن کی شمشیرِ بے زنہار' تیغ برّاں کو ہاتھ میں لے کر پورے کرۂ ارضی پر کفر' شرک' الحاد' دہریت' اباحیت' شیطنت اور ان کے ذریعے پیدا ہونے والے تمام امراض کا قلع قمع کرنا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ "Physician heals thyslef" کے مصداق اس کام کو اپنی ذات سے شروع کیجیے۔ پھر کمر کسیے کہ جہاد بالقرآن کے ذریعے پاکستان کے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنی بہترین توانائیاں' اپنی بہترین صلاحیتیں اور اپنے بہترین اوقات وقف کریں گے' اور اگر اللہ توفیق اور ہمت دے تو پوری زندگی اسی کے لیے وقف ومختص رہے گی' از روئے آیتِ قرآنیہ:

﴿اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُکِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۳﴾﴾ (الانعام)

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو نیز تمام مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسآئر المسلمین والمسلمات